QUARTERLY, PEER REVIEWED
al-amir
ISSN(P): 2790-931X ISSN(E): 2790-9328
E-Mail: editor.alamir@gmail.com

نبی کریم ﷺ بطور سیاست دان؛ ایک تجزیاتی مطالعہ

An analytical study of The Holy Prophet Muhammad's ﷺ Political life

Dr. Tayyaba Razzaq
PhD ,Visiting Lecturer SZIC, University of the Punjab Lahore Pakistan; email, tayyaba.szic@pu.edu.pk
Dr. Hafiz Muhammad Akbar
Assistant Prof. Department of Arabic, Govt. S.E College Bahawalpur. Email: akbarsaeedi63@gmail.com

Islam gave to mankind an ideal code of human rights fourteen centuries ago. These rights aim at conferring honor and dignity on mankind and eliminating exploitation, oppression and injustice. Islam is a social religion, not in the sense that it is through society alone that religion breathes its sacred spirit in the individuals, but in the sense that it aims at inculcating God-consciousness both in individual and society. The Holy Prophet was holding so much important responsibility as the Head of the State; confer at every occasion that he, as the great benefactor, bravely performed legal and political heroic deeds which are examples of their own in the world of deeds. This paper aims to analyze the administration during the time of the Holy Prophet ﷺ and illustrate its importance in today's times. The Holy Prophet ﷺ had introduced basic norms of Public Administration and practically presented an administrative model. The Prophet Muhammad ﷺ acted upon the shariah rules, set many examples and developed devices to resolve disputes by peaceful methods. He ﷺ commanded his nation with honor, justice, equality, peace, and respect to humanity.

Keywords; Holy Prophet ﷺ, Political life, State, peace, justice, Humanity, dignity of mankind.

اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے۔ کوئی شعبہ زندگی اس کی ہدایات سے خالی نہیں۔ وہ نہ تو دین و دنیا کی تفریق کا قائل ہے اور نہ ہی مذہب و سیاست کو الگ الگ سمجھتا ہے۔ اس کی نگاہ میں زندگی ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے اور پوری زندگی کو منشاء الٰہی کے تابع ہونا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی ریاست کے بغیر ایک مسلم معاشرہ کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں مسلمان اپنے ضمیر اور ایمان کے تقاضوں کو اس وقت تک پورا کر ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ اپنی زندگی میں خدا کا قانون قائم نہ کر دے۔ اس سے کم تر کسی مقام پر مسلمان قناعت نہیں کر سکتا[1]۔

ابتدائے اسلام میں حالات اس قدر نامساعد تھے کہ اسلام کا نام لینا بھی جرم سمجھا جاتا تھا۔ عام مسلمانوں کے علاوہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جان تک محفوظ نہ تھی۔ اس صورت حال میں اسلام کے بنیادی تقاضوں پر عمل کرنا بھی ممکن نہ تھا۔ لہٰذا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے مرکز کی تلاش تھی جہاں مسلمانوں کو آزادی کے ساتھ ہر شعبہ زندگی میں اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کا ماحول میسر ہو۔ اس کے لیے بالآخر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اہل یثرب کو آمادہ کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اور ہجرت سے ذرا پہلے ۱۳ نبوی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں کے کچھ سربر آوردہ اشخاص سے ایک معاہدہ فرمایا۔ جنھوں نے آپ کو اپنے شہر یثرب (جس کا بعد میں نام مدینہ النبی معروف ہوا اور پھر مختصر ہو کر صرف مدینہ رہ گیا) آنے کی دعوت دی۔ اس موقع پر ان حضرات نے حضورؐ کے ہاتھ پر ان الفاظ میں بیعت کی:

> ''ہم عہد کرتے ہیں کہ ہم ہر حال میں سمع و طاعت سے کام لیں گے۔ خواہ تنگی ہو یا فراخی۔ اور چاہے خوشحالی ہو یا مصیبت آن پڑے۔ اور ہم جہاں کہیں بھی ہوں گے ہمیشہ سچ بولیں گے۔ نہ تو کسی سے خوف کھائیں گے اور نہ کسی ملامت کرنے والے کی پرواہ کریں گے۔''[2] اسی طرح بیعت (معاہدہ) کے ذریعے ان اہل مدینہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا مذہبی اور سیاسی رہنما تسلیم کر لیا۔ اور پھر ان کی دعوت پر آپؐ اور دیگر مسلمانان مکہ نے مدینہ ہجرت فرمائی۔ قبل اس کے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی کا جائزہ لیا جائے ما قبل سیاسی حالات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل دنیا کا نظام سیاست:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے قبل دنیا کا سیاسی نظام کہیں پہ شخصی حکومت، کہیں موروثی بادشاہت اور کہیں آمریت کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ فارس کا سیاسی نظام جبر و استبداد اور مطلق العنانی کا پہلو لیے ہوئے تھا لیکن چھٹی صدی عیسوی کے خاتمہ تک یہ سلطنت زوال کا شکار ہوگئی اور دنیا کو یہ سبق ملا کہ جبر واستبداد کا نظام زیادہ دیرپا نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ حکمران کے لیے مفید ہے نہ رعایا کے لیے[3]۔

چنانچہ دنیا کی مہذب اقوام، عالمی تہذیبوں اور ان کی نمائندہ طاقتوں روم اور فارس (ایران) میں خالص آمرانہ حکومتوں کا دور دورہ تھا، اس زمانے کی سیاست مطلق العنان بادشاہت تھی، یہ بادشاہت اکثر مخصوص خاندانوں کی عظمت پر قائم ہوئی تھی، جیسا کہ ایران میں تھا، جسے ''فارس'' کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا[4]، یہ اپنی قدامت کے لحاظ سے دنیا کے ان چند خطوں میں شامل ہے جن کی

---

[2] Ḥākim, Al-Mustadrak, 271.

[3] Sīrat Ibn-e-Hashām, 1 : 454.

[4] Bilchalī, Ḥukmarān ky Ikhtiyār wa iqtidār ky liy, 383-385.

تاریخ انتہائی قدیم اور طولانی ہے[5]۔

سلطنت رومہ ہر قانون اور ہر ایک کے حق کو نظر انداز کر سکتی اور ہر ایک کی عزت و ناموس پامال کر سکتی تھی، وہ ہر ظلم و ستم کو جائز سمجھتی تھی، رومیوں کا ہم عقیدہ او رہم مذہب ہو کر حکومت کے ساتھ خلوص اور وفاداری کا اظہار کر کے بھی کوئی قوم یا فرد رومیوں کے ظلم و ستم سے بچ نہیں سکتا تھا، کسی قوم کو حکومت 'خود اختیاری یا اندرونی خود مختاری کا حق حاصل نہیں تھا اور نہ اس کا استحقاق تھا کہ وہ اپنے ملک میں اپنے واجبی حقوق سے مستفید ہو سکے، ان محکوم قوموں اور مفتوح ملکوں کی مثال اس اونٹنی کی سی تھی، جس پر بوقت ضرورت سواری کی جاتی اور اس کا دودھ دوہا جاتا اور صرف اسی قدر اسے چارہ دیا جاتا جو اس کی پیٹھ کو مضبوط اور تھن کو دودھ سے بھرا رکھ سکے۔

بعثت نبویؐ کے وقت دنیا کی دو شہنشاہتیں فارس (ایران) اور روم دو عالمی طاقتوں کے طور پر عالمگیر شہرت رکھتی تھیں۔ ان سلطنتوں میں حکومتی اختیار کا کس طرح غیر ذمہ دارانہ، بلاجواز اور ظالمانہ استعمال ہو رہا تھا[6]۔﴿ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴾ ترجمہ: "خرابی پھیل گئی ہے، خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے نتیجے میں تا کہ اللہ تعالیٰ ان کے بعض اعمال کا مزہ چکھادے اور وہ باز آ جائیں۔" وہ تاریخ کے صفحات پر مخفی نہیں۔ فارس (ایران) کا یہ حال تھا کہ بعض اوقات رعایا کو سرکاری ٹیکس ادا کرنے کی خاطر اپنی اولاد کو بیچنا پڑتا۔

اہل عرب کا نظام سیاست:

جنوبی جزیرۃ العرب:

جزیرۃ العرب کے جنوب میں بعض ممالک جن کے بارے میں قلیل معلومات کے باوجود ان منطقوں میں سیاسی تنظیم کے پائے جانے کی عمومی صورت سامنے آ جاتی ہے اور ان منطقوں میں نمایاں ممالک درج ذیل ہیں:[7]

☆ **مملکت معین:** (۳۶۰۔۲۰۰اق م) کے دوران یمن کے شمال میں۔

☆ **مملکت سبا:**(۹۰۔۱۱۵اق م) کے دوران یمن کے جنوب میں ظاہر ہوئی اور اس نے مملکت معین کو بطور وراثت پایا۔

☆**مملکت قتبان:** یہ یمن کے علاقوں کے جنوب سے درے(۲۵۔۱۰۰اق م) کے دوران تھی۔ یہ معین و سبا کے ہم عصر تھی۔

☆**مملکت حمیر:** یہ یمن میں سبا اور بحر احمر کے مابین ۱۱۵ق م کے بعد وجود میں آئی اور ۶۴۰ سال کے لگ بھگ رہی۔

شمالی جزیرہ:

☆**مملکت مناذرہ:** بعض عربی قبائل یمن سے ہجرت کر کے جزیرۃ العرب کے شمال مشرق میں آباد ہو گئے اور یہ ریاست وجود میں آئی جس نے حیرہ کو اپنا دار الحکومت بنایا اور تہذیب فارس کو اپنایا۔[8]

☆**مملکت غسانسہ:** بعض عرب قبائل یمن سے ہجرت کر کے جزیرہ عرب کے شمال مغرب میں آباد ہوئے۔ یعنی اردن اور جنوبی

---

[5] Nithār Aḥmad, 'Aehd-e-Nabvī mein Riyāsat ka Nashūr wa Irtiqā', 35.

[6] Abu al-Ḥasan Nadvī, Insāni Dunya par Muslilmano ky 'Urūj wa Zawāl ka Athar,66.

[7] Nithār Aḥmad, 'Aehd-e-Nabvī mein Riyāsat ka Nashūr wa Irtiqā', 27.

[8] Mu'jam al-Baldān, 4:310.

شام۔ غسان نامی پر انی پر۔ اور انہوں نے اس کا نام غساسنہ رکھا۔ روم غساسنہ کا حلیف تھا اور فرس مناذرہ کا۔ غساسنہ کی ریاست کی حکمرانی عربی ثقافت اور رومی قانون سے مخلوط تھی۔

بلاد حجاز:

اس وقت بلاد حجاز میں عربوں کی کوئی معروف حکومت نہیں تھی اور نہ ان کا کوئی عدالتی نظام تھا جہاں فیصلوں کے لیے رجوع کرتے اور نہ ہی کوئی منصوبہ امن تھا جو نظام کو مقرر اور اس کی حفاظت کرتا۔ وہاں سرکشوں کی سرکوبی اور مجرموں کو سزا دینے کی امید عبث تھی۔ زیادتی کا شکار اپنے لیے اپنی ذات سے ہی انتقام لیتا یا یہ کہ اس کا قبیلہ اس کی مدد کرتا۔ مکہ میں مناصب کی ایک قسم تھی جو بلاد عرب کے کسی دوسرے علاقے میں نہ تھی اور وہ اس علاقے کے دینی مرکز ہونے، نیز ہر طرف سے آنے والے حجاج کے وفود کے باعث تھی۔

بعض محققین نے اسے ۱۶ مناصب تک شمار کیا ہے۔ جن میں سے حجابت، سقایہ اور رفادت تھے اور انہوں نے انہیں سیاسی اقتدار کی اقسام قرار دیا حالانکہ زیادہ قرین حقیقت یہ ہے کہ وہ اشرافیہ کے مناصب تھے جن کا تقاضا علاقے کا مزاج اور حجاج کے حالات کرتے تھے۔ وہ کسی قسم کا سیاسی تسلط نہیں تھا۔

بلاد حجاز کے سیاست سے فارغ ہونے کی تائید جس چیز سے ہوتی ہے وہ یہ کہ جب ابرہہ اشرم کعبہ شریف کو منہدم کرنے کے لیے آیا تو جناب عبد المطلب نے نکل کر اس سے اپنے اونٹوں کی واپسی کا مطالبہ کیا اور مکہ و اہل مکہ کے بارے میں کوئی جھگڑا نہیں کیا۔[9] نیز تجدید کعبہ کے موقع پر حجر اسود کی تنصیب پر اختلاف بھی اسی موقف کی تائید میں ہے۔ اگر بلاد میں کوئی سیاسی اقتدار ہوتا تو اس قسم کی مشکلات میں اس کی طرف رجوع کیا جاتا۔[10] لیکن ان عربی قبائل نے سفارت کاری جیسا احلاف و جوار (Good Neighbourhood) کا طریق کار اپنا رکھا تھا۔ احلاف جمع ہے حلف کی جو اصل میں ایک طرح کا باہمی تعاون، امداد اور نصرت کا معاہدہ ہوتا تھا۔

جاہلیت کے احلاف میں سے ایک بھلائی کے لیے تھا مثلاً حلف الفضول' جس میں قریش کے رشتہ داروں نے عبد اللہ بن جدعان کے گھر عہد کیا کہ اگر مکہ میں کسی پر ظلم کیا گیا تو وہ اس مظلوم کا ساتھ دیں گے حتیٰ کہ ظلم کا ازالہ ہو جائے۔ اور ان میں سے ایک شر کا معاہدہ تھا، جیسے قریش کا نبی ﷺ، آپ کے صحابہؓ اور بنی ہاشم کا شعب ابی طالب میں محصور کرنے کا باہمی حلف تھا۔ ان میں سے جو بھلائی پر مبنی تھا، اسلام نے اس کی توثیق کی اور ان میں سے جو شر پر مبنی تھا، اسلام نے اسے باطل قرار دے کر توڑ ڈالا۔ جہاں تک جوار کا تعلق ہے اس کا مقصود پناہ گزین کی حمایت اور اسے قوت بہم پہنچانا تھا[11]۔ نیز جاہلیت میں ایک دوسرے کو پناہ دینا۔ کوئی نہیں چاہتا تھا کہ عرب سنیں کہ اس نے اپنے معاہدے کے بارے میں شرمندگی اٹھائی ہے۔[12] جاہلیت میں جوار صرف ظلم کے خلاف حمایت نہ تھی بلکہ معاملہ ظالموں کے اجارہ تک بڑھ گیا، جسے اسلام نے حرام قرار دیا اور اس کے عامل کو عذاب کی دھمکی دی۔[13]

---

[9] Ibn-e-Kathīr, Albidāyah wa al-Nihāyah,2:170-176.

[10] Sīrat Ibn-e-Hashaām,4:75.

[11] Al-Zubeidī, Tāj al- 'Urūs, 4:75.

[12] Sheikh Muḥammad Bin Razzāq Bin Tarhūnī, Saḥīḥ Sīrat al-Nabaviyyah,1:113.

[13] Dr. Sulemān al- 'Īd, Al-Nizām al-Siyāsī fi al-Islām, 32.

اسلام سے قبل عرب قبائل متفرق تھے جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے رسولؐ پر احسان جتلاتے ہوئے فرمایا:﴿وَ اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِہِمْ١ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّاۤ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِہِمْ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ اَلَّفَ بَیْنَہُمْ اِنَّہٗ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ﴾ الانفال : 6

یہی حال اوس و خزرج کا مدینے میں تھا اور بقایا قبائل عرب بھی اس حقیقت سے دور نہیں تھے۔ ان کے دل پھٹے ہوئے تھے۔ ان کے مابین جنگیں نہایت بے ہودہ اسباب سے چھڑ جاتیں جن میں سے کچھ درج ذیل ہیں:

☆**حرب بسوس:** بنی وائل کے دو قبیلوں بکر اور غالب کے درمیان تھی۔ وہ صرف ایک اونٹنی کے سبب چالیس سال تک ہوتی رہی۔

☆**حرب داحس والغبر:** عیث وضبیان کے مابین چالیس سال تک جاری رہی۔ اس کا سبب صرف یہ تھا کہ دو گھوڑوں میں سے کس کے گھوڑے کو پہلے آگے گزرنا ہے۔

☆**ایام الفجار:** یہ جنگیں نبی کریم ﷺ کی بعثت سے ۲۶ سال قبل حجاز کے عربوں کے مابین حرمت والے مہینوں میں ہوئی۔[14]

اسلام سے پہلے تاریخ عالم کی مشہور ومعروف حکومتیں سلسلہ بسلسلہ قائم ہوتی رہیں۔ ایک حکومت قائم ہو کر ختم ہو جاتی تو دوسری حکومت منظر عام پر آتی۔ آخر اسلام ظاہر ہوا اور اس نے سب سلطنتوں اور حکومتوں کو فطری حکومت کے نظریہ اور نظام اساسی سے آشنا کیا۔

اسلام کا نظام اعتدال وتوازن:

اسلام زندگی کے ہر معاملے میں اعتدال کا درس دیتا ہے اور درمیانی راہ اختیار کرنا پسند کرتا ہے کیونکہ اسی میں امن بھی ہے اور عافیت بھی۔ ارشاد ربانی ہے:" اور نہ رکھ اپنا ہاتھ بندھا ہوا اپنی گردن کے ساتھ اور نہ کھول دے اس کو بالکل کھول دینا پھر تو بیٹھ رہے الزام کھایا ہارا ہو[15]"۔ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا:" کاموں میں بہترین کام توسط کا ہے[16]"۔ امام الانبیاء ﷺ نے عبد اللہ بن عمرو کو فرمایا:" رات میں عبادت بھی کرو اور سوؤ بھی، روزہ بھی رکھو اور کبھی افطار بھی کرو۔ اس لیے کہ آپ کے بدن کا، آنکھوں کا، مہمان کا اور بیوی کا آپ پر حق ہے[17]"۔ اسلام زندگی کے ہر معاملے درمیانی راہ اختیار کرنا پسند کرتا ہے۔

مدینہ کی اسلامی فلاحی ریاست:

یہ ایک تاریخ ساز حقیقت ہے کہ معلم بنی نوع آدم، محسن انسانیت، پیغمبر رحمت، حضرت محمد ﷺ کی بعثت تاریخ کے ایسے دور میں ہوئی، جب پوری دنیا میں کہیں بھی مثالی فلاحی ریاست کا وجود نہ تھا، ایک ایسی فلاحی ریاست جس کے حکمران دیانت و امانت، خود احتسابی، احساس ذمہ داری، فرض شناسی، جواب دہی کے تصور سے آشنا ہوں، جہاں ارباب اختیار من مانی نہ کرتے ہوں، جہاں قومی اور ملکی اثاثوں کو آباء و اجداد کی میراث اور ذاتی ملکیت نہ سمجھا جاتا ہو بلکہ اس کی اساس خوف خدا، پرہیز گاری، دیانت و امانت، احساس ذمہ داری، اعلیٰ اخلاق، آفاقی اقدار اور ابدی اصولوں پر استوار ہو۔ کرہ ارض عالمی تہذیبیں اور اقوام عالم، ایک مثالی، فلاحی اور منظم ریاست

---

[14] Ibn-e-Athīr, Al-Kāmil Fi al-Tārīkh, 1:384.

[15] Banī Isrā'īl, 29.

[16] Beihaqī, Shu'b al-Īmān, Hadith No. 6601.

[17] Bukhārī, Al-Jāmi' al-Saḥīḥ, Hadith no.5783.

کے خلا کو محسوس کر رہا تھا۔۔ آپؐ نے تاریخ انسانیت میں پہلی مرتبہ میثاق مدینہ کی شکل میں دستور ریاست نافذ کیا ہے[18]۔

سرور کائنات امام الانبیاء، سید المرسلین، رحمۃ للعالمین، فخر دو عالم، سرکار دو جہاں حضرت محمد ﷺ کی مثالی تعلیمات، اعلیٰ اخلاقی اقدار، بے مثال سیرت طیبہ اور دائمی وابدی نمونہ عمل، اسوہ رسول نے اس خلا کو فکری و عملی دونوں سطحوں پر پر کیا اور عالم انسانیت کو ریاست و جہاں بانی کے لیے آفاقی اصول وضوابط عطا فرمائے، جن کی افادیت اور اخلاقی اہمیت سے انسانی تہذیب اور اقوام عالم کبھی بھی مستغنی نہیں ہو سکتے۔

نبی اکرم ﷺ بحیثیت مدبر و منتظم ریاست:

احمد مجتبیٰ ﷺ کی ذات میں ایک حاکم و فرمانروا، سیاست دان اور عظیم مدبر و منتظم سب کی خصوصیات بدرجہ اتم موجود تھیں۔ آپ ﷺ کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے۔ آپ ﷺ کی بیعت سے منحرف ہونا دراصل اللہ کی حاکمیت کا انکار کرنا ہے۔ رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت سے ہٹ کر کوئی اطاعت نہیں ہے۔ بلکہ یہ اللہ کے حکم اور اس کی ہدایت کے تابع ہے۔ رسول جو منصب رسالت کا امین ہوتا ہے، اپنی اطاعت کروانے نہیں بلکہ اللہ کی اطاعت کا مکمل پروگرام پہنچانے کا مشن لے کر اللہ کی طرف سے آتا ہے۔ قرآن پاک کی اس آیت میں آپ ﷺ کی اطاعت کا حکم موجود ہے: ﴿ وَ مَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ [19]

نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی عظیم مدبر و منتظم بھی تھی اور آپ کی مکی زندگی میں قبل از نبوت کے واقعات آپ ﷺ کی سیاست اور اجتماعی شعور و تدبیر کی بہترین مثال ہیں۔ ان میں سے پہلا واقعہ حلف الفضول کا ہے۔ جس کے متعلق نبی کریم ﷺ فخر یہ یہ بات فرمایا کرتے تھے کہ میں اس معاہدے میں شریک تھا[20]۔ رسول اللہ ﷺ کی سیاسی تدبیر کی دوسری شہادت حجر اسود کے نصب کرنے کا واقعہ ہے[21]۔ جب سب نے اس کو نصب کرنے میں اپنا اپنا حق تفوق پیش کیا تھا۔ اس وقت اختلاف و منافرت کی جو آگ کتنے ہی لوگوں کو خاکستر کرنے والی تھی وہ آپ ﷺ کے تدبر سے بجھ گئی اور اہل مکہ میں آپ کی عظمت کے ساتھ ساتھ آپ کی فراست بھی واضح ہو گئی۔

بہترین فرماں روا اور حاکم:

احمد مرسل ﷺ نے مدینہ منورہ میں آکر رسالت کے ساتھ فرمانروا اور حکمران کی حیثیت سے مدنی زندگی کا آغاز کیا کیونکہ مکہ میں آپ ﷺ کی حیثیت حکمران کی نہیں تھی اور نہ اقتدار وہاں رسول عربی ﷺ کے پاس تھا[22]۔ آپ ﷺ نے اللہ کی ہدایت کی روشنی میں اپنے حسن تدبر اور حسن انتظام سے مدینہ میں مثالی سلطنت اور ایسا مثالی معاشرہ قائم کیا جو بھائی چارے، اخوت، ہمدردی اور ایثار میں اپنی مثال آپ تھا۔ آپ ﷺ کی سیاست میں حکمت اور دور اندیشی نمایاں تھی۔ آپ ﷺ مذہب کے ساتھ ساتھ ریاست کے بھی سربراہ تھے۔ اس لحاظ سے آپ کی اکیلی شخصیت میں دینی و دنیاوی ہر دو قسم کا اقتدار جمع تھا۔ لیکن نہ تو آپ ﷺ کو پوپ (عیسائیوں کا سب سے بڑا راہنما) کا سا جھوٹا غرور تھا اور نہ ہی قیصر کی طرح کوئی فوج آپ ﷺ کے پاس تھی۔

---

[18] Ibn-e-Kathīr, Albidāyah wa al-Nihāyah, (Berūt: Dār al-Ma'rifah, 1969), 228.

[19] Al-Nisā', 64.

[20] Ibn-e-Sa'd, Tabqāt al-Kubrā, 1:281.

[21] Sīrat Ibn-e-Hashaām,1:209.

[22] Muḥammad Ḥussain Heikal, Ḥayāt-e-Muḥammad, 281.

آپ ﷺ نے سیاست میں اخلاقی عناصر داخل کیے اصل سرچشمہ اقتدار ذات واحد اللہ تعالیٰ کو قرار دیا اوراپنے آپ کو اس کا رسول اور نائب۔ ساتھ ہی امت کے لیے لائے ہوئے احکام اپنے اوپر بھی مساوی طور پر واجب التعمیل قرار دیے۔ اور عہد نبویؐ میں ذات اقدسؐ کے خلاف دیوانی اور ٹارٹ ضمان کے جو مقدمات دائر ہوئے، ان کی موجودگی میں کہاجاسکتاہے کہ اسلام میں(King can do not wrong) حاکم وقت (بادشاہ) کسی فعل ناجائز کا مرتکب ہو ہی نہیں سکتا کو مسترد کر دیا۔ اور جب مملکت کا قوی ترین شخص قانون کی خلاف ورزی پر عدالت کی دار وگیر سے محفوظ نہ رہے تو دیگر عہدیدار اور عام لوگ بھی تعمیل زیادہ توجہ کے ساتھ کریں گے۔

ہجرت مدینہ کے ساتھ ہی حضور اقدس ﷺ نے سب سے پہلے مسجد کی بنیاد ڈالی تاکہ آپ وہاں تمام مسلمانوں کے ساتھ سب سے اہم فریضہ (نماز) کی ادائیگی نیز اسلام کی تعلیم و تبلیغ کے لیے جمع ہو سکیں۔

دوسرا کام جو حضور اقدس ﷺ نے انجام دیا وہ مہاجرین وانصار کے درمیان مواخاۃ کا قیام تھا۔ چونکہ قرآن پاک تمام مسلمانوں کو بھائی بھائی قرار دیتاہے۔ لہٰذا آپؐ نے اس اسلامی برادری کا آغاز اس طرح کیا کہ پہلے تو ان تمام امتیازات کو محو کر دیا جو اہل مکہ اور اہل مدینہ کے درمیان مدتوں سے قائم تھے۔ پھر تمام مسلمانوں کے درمیان مواخاۃ قائم کر دی۔ اس سلسلے میں آپؐ نے ایک فہرست بنادی کہ ایک مہاجر کے ساتھ ایک انصاری بھائی تھا۔ اس بھائی چارے کی وجہ سے ایک طرف مسلمانوں میں باہم محبت ویگانگت کا رشتہ قائم ہوا اور دوسری طرف مہاجرین کی آباد کاری کا مشکل مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ انصار تو اس بات پر بھی تیار تھے کہ اپنی تمام جائیداد میں مہاجر بھائیوں کو برابر شریک رکھیں گے لیکن خود مہاجرین اپنے انصار بھائیوں پر بار بننا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے جلد ہی ان کی مدد سے اپنے آپ کو مختلف مشاغل میں مصروف کر لیا۔

اب جو اہم اور پیچیدہ امور حضور اقدس ﷺ کی فوری توجہ کے مستحق تھے ان میں سے ایک تو اسلامی جماعت کی سالمیت اور اتحاد کو برقرار رکھنے کا مسئلہ تھا اور دوسرا یہود مدینہ اور دیگر غیر مسلم عناصر سے معاہدات یا باہمی حفاظت کے صلح نامے وغیرہ۔ نیز مدینہ کے نظم ونسق اور اس کی حفاظت وانتظام کا معاملہ بھی تھا اور ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ اس نوزائیدہ اسلامی معاشرہ کی حفاظت وبقا کے لیے ناگزیر تھا۔ شہر مدینہ کا عالم یہ تھا کہ وہاں کے مشہور قبائل اوس اور خزرج کوئی بارہ ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے تھے جبکہ یہودیوں کے دس قبیلے الگ تھے۔ ان کے درمیان صدیوں سے دشمنی اور خون ریزی چلی آتی تھی۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے مدینہ کی آمد کے چند ماہ بعد ہی آپؐ نے ایک منشور مرتب فرمایا۔

اب مدینہ ایک مکمل شہری ریاست کی حیثیت اختیار کر گیا بلکہ اس کے ذریعے آپؐ نے تمام منتشر ومتفرق قبائل کو بالعموم اور اہل مدینہ کو بالخصوص ایک قانون پر متفق ومتحد کر دیا۔ پھر جہاں تک شخص حقوق کا تعلق ہے اس سلسلے میں "منشور مدینہ" ایک انقلابی اقدام کی حیثیت رکھتاہے۔ کیونکہ پہلے جو حق کسی فرد یا اس کے خاندان کو حاصل تھا۔ وہ اب ایک عوامی معاملہ بن گیا اور اس طرح ایک طرف تو قبائلی طوائف الملوکی کا خاتمہ ہو گیا اور دوسری طرف صحیح معنی میں ایک اسلامی ریاست کی بنیاد پڑ گئی۔

میثاق مدینہ کی دفعات کے مطابق آنحضرت ﷺ نے تمام انتظامی اور فوجداری اختیارات اپنے لیے مخصوص کر لیے۔ اگرچہ آپؐ کے نقشہ سیاست میں حاکمیت یا اقتدار اعلیٰ کا اصولی منصب اللہ تعالیٰ رب العالمین کے لیے مخصوص تھا[23] اور آپؐ اس کے ایک نائب کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس لیے جس قانون کا نفاذ آپؐ دوسروں پر کرتے اس کو اپنے اوپر بھی نافذ کرتے تھے۔ میثاق مدینہ کے دو

[23] Dr. Amīr Ḥassan Siddīqī, Islāmī Riyāsat (Karāchī: Jamī'at al-Falāḥ, 1966), 37.

حصے کیے جاسکتے ہیں۔ پہلا حصہ (جس میں ۲۳ دفعات ہیں) مہاجرین وانصار سے متعلق ہے۔ اور دوسرا حصہ یہود مدینہ کے حقوق و فرائض سے بحث کرتا ہے۔ منشور میں یہ بات صاف ہے کہ آپؐ کا فیصلہ قطعی ہو گا۔ اور آپؐ ہی آخری عدالت مرافعہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہود جو عربوں پر ثقافتی برتری بھی رکھتے تھے ان کا اس دفعہ کو قبول کرنا بلاشبہ سیاست نبویؐ کا ایک اعجاز ہے۔

میثاق مدینہ کے اہم نکات:

میثاق مدینہ کا ابتدائی حصہ مہاجرین، انصار اور دیگر تمام مسلمانوں سے متعلق تھا۔ اس منشور کی رو سے حقوق و فرائض کے لحاظ سے سب مساوی سمجھے جاتے تھے۔ صلح و جنگ کے معاملات کو مشترکہ یعنی ریاستی معاملہ قرار دیا گیا۔ ہر ایک صلح و جنگ میں ایک فریق کی حیثیت رکھتا تھا۔ فوجی خدمت سب کے لیے ضروری قرار دی گئی۔ یہ طے کیا گیا کہ حفاظت کی ضمانت دینا ہر فرد کا حق ہے خواہ وہ اعلیٰ ہو یا ادنیٰ۔ اور معمولی سے معمولی آدمی کا کیا ہو امعاہدہ سب سے لازم ہو گا۔ جہاں تک لوگوں کی حفاظت اور مدافعت ہے اس منشور کی روشنی میں قریش مکہ کو کسی حالت میں پناہ نہیں دی جائے گی۔ عدالتی اختیار کو مرکزیت دے دی گئی تھی۔ یہ فی الحقیقت ایک انقلابی قدم تھا جس سے انصاف اور غیر جانبداری کی ارزانی ہو گئی۔ تمام مسلمان بحیثیت مجموعی اس امر کے ذمہ دار تھے کہ نہ کوئی شخص کسی پر دست درازی کر سکے اور نہ کسی کی حق تلفی ہو۔

میثاق مدینہ کا دوسرا حصہ یہودیوں سے متعلق تھا۔ جس میں تمام یہودی ایک جماعت کی حیثیت سے وفاقی طرز کی شہری ریاست مدینہ سے منسلک تھے۔ اس حصہ کی پہلی اہم دفعہ یہ تھی کہ اگر جنگ کے موقع پر یہود اور مسلمان اشتراک کریں گے تو وہ اپنے خرچ کے ذمہ دار ہوں گے اور دونوں مذاہب کی پیروی میں آزاد رہیں گے[24]۔ تمام تمدنی اور ثقافتی معاملات میں یہودیوں کو مسلمانوں کے برابر حقوق دیئے گئے۔ اسی طرح جہاں تک دفاع کا تعلق ہے، یہودی اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کے حلیف بن گئے۔ علاوہ ازیں یہودیوں کو مسلمانوں کے ساتھ مدینہ کی حفاظت میں حصہ لینا پڑے گا۔ اگر مسلمانوں پر کوئی جارحانہ کارروائی کرے گا تو یہودی مدد کریں گے۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ابتداء میں یہودیوں نے اہل مکہ سے جنگ کے موقع پر غیر جانبداری اختیار کئے رکھی لیکن کچھ عرصہ بعد ہی انہوں نے عہد شکنی کا ارتکاب کیا۔ او روقت کے ساتھ ساتھ یکے بعد دیگرے کھلی بغاوت پر اتر آئے تو اس وقت حضور اقدس ﷺ نے انہیں سزائیں دیں اور مدینہ سے بے دخل کر دیا۔

ریاست مدینہ کے دفاع کے لیے ضروری تھا کہ اندرونی استحکام کے ساتھ ساتھ پڑوسی قبائل سے بھی دوستانہ تعلقات استوار کئے جائیں۔ چنانچہ آپؐ نے مغربی علاقوں اور سرحدی اضلاع کا دورہ فرمایا اور مختلف قبائل سے معاہدے کئے جس کے نتیجہ میں بعض قبائل دفاع کے لیے معاملے میں مسلمانوں کے حلیف بن گئے۔ بعض نے یہ عہد کیا کہ وہ مسلمانوں کے دشمنوں سے دوستی نہ کریں گے۔ جبکہ بعض قبائل نے اس معاملہ میں اتفاق نہیں کیا۔ غرض اس طرح مدینہ کے گردونواح کے قبائل سے دشمنی کے بجائے زیادہ سے زیادہ دوستی کرنے کے لیے آپؐ نے کوششوں میں کسی قسم کی کمی نہیں کی۔

قریش مکہ کے ساتھ معاملہ:

مسلمانوں کے سب سے بڑے مخالف اور کھلے دشمن قریش مکہ نے مسلمانوں پر کئی سالوں تک یکے بعد دیگرے کئی چھوٹی بڑی

[24] Sīrat Ibn-e-Hashaām,1:504.

جنگیں مسلط کیں جن کا مسلمانوں نے افرادی قوت اور سامان حرب کی کمی کے باوجود پامردی اور ثابت قدمی سے مقابلہ کیا۔

بالآخر آنحضرت ﷺ نے قریش کو امن کے معاہدے پر آمادہ کر لیا۔ جسے "صلح حدیبیہ" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ معاہدہ اگرچہ بظاہر قریش کی سخت شرائط کو قبول کر کے کیا گیا، مگر مسلمانوں کے لیے قرآن پاک نے اسے فتح مبین قرار دیا۔ اس معاہدہ کے تحت قریش دس سال تک کے لیے جنگ بندی پر آمادہ ہوگئے، جس سے نہ صرف یہ کہ آپؐ کو پورے عرب میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا بہترین موقع ملا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو اسلام کے دوسرے بڑے دشمن یہود خیبر کی سازشوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کا موقع ہاتھ آیا۔ پھر بعد میں اہل مکہ کی طرف سے عہد شکنی کے نتیجہ میں حضور اقدس ﷺ کو خود مکہ مکرمہ کو بھی فتح کرنے کا موقع مل گیا۔ یہ کام سن ۸ ہجری تک پورا ہو گیا۔ یہ آخری قدم تھا جس کے بعد تقریباً سارا جزیرہ نما عرب آپؐ کے زیر نگیں آ گیا۔ اور اس طرح آپؐ نے اپنی زندگی ہی میں اسلامی ریاست کو مضبوط بنیادوں پر قائم فرما دیا۔

ریاست مدینہ کی خصوصیات:

آنحضرت ﷺ کی قائم کردہ ریاست کی نمایاں خصوصیات یہ تھیں:

۱۔ ریاست مدینہ کی بنیاد ایک ایسے معاہدے پر رکھی گئی تھی جس میں ہر فریق مشترکہ طور پر اپنی ذات اور اپنی تمام قوت کو ادارہ اجتماعی کے حوالے کرتا ہے اور اس کے عوض میں ہر فرد کل کا ایک لازمی جزو بن جاتا ہے[25]۔ تاریخی انسانی میں اپنی نوعیت کا منفرد واقعہ ہے، جس میں بیعت کے ذریعے سے اہل مدینہ نے برضا و رغبت آپؐ کو مذہبی رہنما کے علاوہ سیاسی حکمران بھی تسلیم کر لیا۔ یہ اس بات کا صاف اظہار ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی قائم کردہ اسلامی ریاست لوگوں کی باہمی رضامندی کا نتیجہ تھی۔

۲۔ یہ ایک ایسی ریاست تھی جس میں اقتدار اعلیٰ کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات تھی۔ اس کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ ملک اللہ تعالیٰ کا ہے اور وہی اس کا اصل حاکم ہے۔ حکم دینے اور قانون بنانے کا حق صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ قرآن مجید اس پر واضح شہادت دیتا ہے:

﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ ﴿ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ﴾ ایک اور موقع پر ارشاد ہے: فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ﴾ اسی سورۃ میں ارشاد ہے: ﴿ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ ایک مقام پر بانداز استفہام ارشاد ہوا ہے: ﴿ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ﴾[26] گویا حاکمیت بھی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور قانون ساز بھی وہی ہے۔ کوئی انسان خواہ وہ رسول ہی کیوں نہ، اپنی منشاء سے حکم دینے کا حق نہیں رکھتا۔

اسی طرح اولی الامر اور صاحب اختیار وارباب حل و عقد کی اطاعت بھی صرف اسی صورت میں واجب کی گئی ہے جبکہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے مطیع ہوں۔

اقتدار اعلیٰ کے لیے قرآن پاک نے نہایت جامع لفظ استعمال کیا ہے جس کے ذریعے واضح کیا گیا ہے کہ کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کے زیر اقتدار ہے۔

---

[25] Dr. Amīr Ḥassan Siddīqī, Islāmī Riyāsat, 42.

[26] Al-Baqarah, 2:115.

جہاں تک اس مقتدر اعلیٰ کے اختیار اور اس کی صفات کا تعلق ہے تو وہ مقتدر اعلیٰ مختار مطلق ہے ﴿ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴾ ۔ غیر مسئول اور غیر جواب دہ ہے ﴿ لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْئَلُوْنَ ﴾ ۔ وہی تمام اقتدار کا مالک ہے جس کے اختیارات کو محدود کرنے والا کوئی نہیں اور اس کی ذات منزہ عن الخطاء ہے ﴿ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ ﴾ ۔ وہ اپنے بندوں، اپنی رعایا پر کامل اختیار رکھتا ہے ﴿ وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ﴾۔ اور اس کے مثل کوئی نہیں ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ ۔ وہ حقیقی بادشاہ ہے ﴿الْمَلِكُ الْحَقُّ﴾ ۔ اور تمام (عارضی) حکمرانوں کا اختیار بھی اسی کے قبضہ قدرت میں ہے ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ﴾[27] ، خدایا، ملک کے مالک، تو جسے چاہے ملک دے اور جس سے چاہے چھین لے۔

یہ ہے وہ تصور حاکمیت جو اسلام پیش کرتا ہے اور جسے نبی کریم ﷺ نے اسلامی ریاست میں قائم فرمایا۔ اس تصور حاکمیت کے لحاظ سے حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ میں انسان کا سرے سے کوئی حصہ نہیں ہو سکتا۔ اسلام اسی بناء پر انسان کو زمین پر خدا کا خلیفہ یا نائب قرار دیتا ہے اور نائب کا اصل وظیفہ حیات یہ ہے کہ وہ دنیا میں اپنے مالک کے حکم کے مطابق کام کرے۔ اس طرح اسلام انسان کے لیے حاکمیت کے بجائے خلافت کو خاص کرتا ہے کیونکہ حاکمیت صرف اللہ کی ہے اس لیے جو کوئی زمین پر حکمران ہو اسے لامحالہ حاکم اعلیٰ کا خلیفہ ہونا چاہیے جو محض تفویض کردہ اختیارات استعمال کرنے کا مجاز ہو گا۔ یہ خلافت و حکومت عمومی ہے کسی خاندان، گروہ، شخص یا طبقہ سے مخصوص نہیں اور اس کا استحقاق صرف ایمان اور عمل صالح کی بنیاد پر پیدا ہوتا ہے۔

۳۔ ریاست مدینہ ایک نظریاتی اور دستوری ریاست تھی۔ اس سلسلے میں دو باتیں قابل ذکر ہیں۔ ایک یہ کہ حضور اقدسؐ نے ریاست کے قیام کے ساتھ ہی "تحریری دستور" بھی مرتب فرما دیا۔ جس میں واضح طور پر ریاست میں بسنے والے تمام عناصر کے درمیان حقوق و فرائض کی واضح تعیین و تقسیم کر دی گئی اور یہ دنیا کا پہلا تحریری دستور تھا جو دنیا کی کسی مملکت میں نافذ کیا گیا۔

اس ریاست کا دوسرا قابل ذکر پہلو یہ تھا کہ وہ اصولی اور نظریاتی ریاست تھی۔ کیونکہ اس کی بنیاد نہ نسل و وطن کی بنیاد پر تھی نہ رنگ و زبان پر اور نہ محض معاشی یا سیاسی اشتراک نے اسے جنم دیا، بلکہ وہ اسلامی نظریہ حیات کی علمبردار اور قرآنی اصولوں کی حامل تھی۔ نیز اس کے قیام کا مقصد بھی متعین و واضح تھا۔ اس بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ﴾[28]

اس طرح یہ ریاست ایک نظریاتی ریاست تھی جس کی اصل ذمہ داری ان اصول و نظریات کی سربلندی ہے جنہیں قائم کرنے کے لیے اس کی تاسیس عمل میں آئی تھی۔ اسلامی ریاست کا قیام بجائے خود مقصود نہیں بلکہ ایک اعلیٰ تر نصب العین کے حصول کا ذریعہ ہے۔ یعنی اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت اور ان کی رضا کا حصول۔

۴۔ ریاست محض دین وسیاست کا حسین امتزاج تھی۔ چونکہ اسلام ایک مکمل دین ہے اور زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کے متعلق اس نے تفصیلی ہدایت نہ دی ہو۔ اس لیے اس ریاست میں تمام معاملات کو الہامی ہدایات کے مطابق انجام دیا جاتا تھا۔ ایک طرف حضور اقدسؐ سربراہ ریاست تھے تو دوسری طرف اشاعت اسلام ، نمازوں کی امامت، فوج کی قیادت ، وفود سے ملاقات

[27] Āl-e-Imrān, 3:26.
[28] Āl-e-Imrān, 3:159.

اور مقدمات کے فیصلے وغیرہ سب کچھ خود ہی فرمایا کرتے تھے۔ اس ریاست میں دین و دنیا یا سیاست و مذہب کا الگ الگ دائرہ کار نہ تھا۔

۵۔ یہ ایک شورائی اور جمہوری ریاست تھی۔ قرآن پاک کے ارشادات [29] کے پیش نظر تمام امور مملکت الہامی ہدیات کے ساتھ ساتھ آپس کے مشورہ سے انجام دیئے جاتے تھے۔ بعض اوقات انتظامی معاملات میں صحابہ کرامؓ نے حضور اقدسؐ سے رائے میں اختلاف بھی کیا اور آپؐ نے ان کی رائے کے مطابق فیصلہ فرمایا۔

۶۔ ریاست میں اس بات کا پورا اہتمام تھا کہ کم از کم بنیادی حقوق سے ایک شخص کو کسی حال میں محروم نہ رکھا جائے یعنی اس کے جان و مال اور ناموس کی حفاظت کی جائے۔ اس کے لیے قصاص و دیت اور حدود و تعزیرات کا قانون لاگو کیا گیا۔ جس کے باعث مختصر عرصہ میں عرب معاشرہ امن و تحفظ کا گہوارہ بن گیا اور جرائم کی شرح انتہائی کم ہو گئی۔ اسلامی سزائیں جو بظاہر سخت نظر آتی ہیں جرائم کے انسداد کے لیے نہایت حکیمانہ اور مؤثر ہیں۔

۷۔ ریاست کی بنیاد ہی بے لاگ عدل و انصاف پر قائم تھی۔ قانون ہر ایک پر یکساں طور پر عائد ہوتا تھا۔ حتی کہ ایک مرتبہ آپؐ نے یہ کہہ کر عدل و انصاف کے معاملے میں ہر قسم کی بدعنوانیوں کا خاتمہ کر دیا کہ "اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے ،اگر فاطمہؓ بنت محمدؐ نے بھی چوری کی ہوتی میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔" یہ ہے وہ سیاسی، قانونی اور معاشرتی مساوات وعدل کا نمونہ جسے حضورؐ نے اس ریاست میں قائم فرمایا تھا۔ پھر آپؐ ایسے لوگوں کو قاضی مقرر فرماتے تھے جو شریعت کا گہرا علم رکھتے ہوں۔ متقی اور نیک کردار ہوں۔

۸۔ یہ ایک فلاحی ریاست تھی۔ جو نہ صرف عوام کی معاشی کفالت و معاونت کی کوشش کرتی تھی بلکہ اس سلسلے میں عطایا اور وظائف کی تقسیم نیز زکوٰۃ، خیرات اور صدقات کی مرکزی طور پر تحصیل و استعمال اس کے بنیادی اعمال تھے۔ زکوٰۃ و صدقات کے متعلق یہ اصول لاگو فرمایا "تؤخذ من اغنیاء ھم و ترد الی فقراء ھم" یعنی ان کے غنی لوگوں سے وصول کر کے ان کے محتاج لوگوں میں تقسیم کی جائے گی۔

آپؐ نے زکوٰۃ و صدقات کے مال سے اپنے علاوہ اپنے اہل و عیال کو بھی دور ہی رکھا۔ حتی کہ آپؐ کے نواسہ حضرت حسنؓ نے صدقہ کی ایک کھجور اٹھالی تو آپؐ نے اسے تنبیہ فرماتے ہوئے وہ کھجور ان کے منہ سے نکال دی۔

آپؐ نے اپنے عمل سے یہ نمونہ پیش فرمادیا کہ قومی خزانے پر سربراہ مملکت کا کوئی امتیازی حق نہیں ہے۔ ایک موقع پر حضرت فاطمہؓ کی درخواست پر بھی معذرت کرتے ہوئے فرمایا: "میرے پاس خادم تو نہیں ہے البتہ میں تجھ کو وہ چیز بتاتا ہوں جو خادم سے بہتر ہے" [30]۔ آپؐ نے اپنی ذات کو کبھی اوروں پر ترجیح نہیں دی۔ فاقہ کے سبب اگر صحابہ کرامؓ کو پیٹ پر پتھر باندھنا پڑے تو آپؐ نے بھوک کے باعث دو پتھر باندھ رکھے تھے۔ اور غلاموں کے متعلق (جن کا کوئی پرسان حال نہ تھا) آپؐ نے خصوصی ہدایات دیں کہ یہ تمہارے بھائی ہیں، جو خود کھاؤ وہ انہیں کھلاؤ اور جو خود پہناؤ وہ انہیں پہناؤ اور ان پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالو۔

۹۔ یہ ریاست اخلاقی تزکیہ و تربیت اور دینی تعلیمی و ترویج کی بھی ذمہ دار تھی۔ حضور اقدسؐ کا ارشاد ہے کہ "میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں"۔ آپ ہمہ وقت مسلمانوں کی تعلیم و تربیت میں مصروف رہتے تھے۔ مسجد نبویؐ میں مسافر طلباء کے لیے ایک اقامت گاہ "صفہ"

[29] Al-Shūra: 28.

[30] Safī al-Raḥmān, Al-Raḥīq al-Makhtūm (Lahore: Maktabah Salfiyyah, 2003), 412.

کے نام سے قائم تھی جہاں وہ ہر وقت حصول علم میں مصروف رہتے تھے۔ آپؐ معلموں کو مختلف علاقوں میں تعلیم و تربیت کے لیے بھیجا کرتے تھے۔ مثلاً حضرت مصعب بن عمیرؓ کو اہل مدینہ کی تعلیم کے لیے اپنی ہجرت سے پہلے بھیجا تھا۔ مدینہ کے باہر سے جو لوگ مسلمان ہوتے انہیں کچھ وقت کے لیے مدینہ میں ٹھہرایا جاتا اور دین کی بنیادی تعلیمات سے روشناس کرا کے واپس بھیجا جاتا۔ نیز جنگ بدر کے قیدیوں کے ذریعے مسلمان بچوں کے لیے نوشت و خواند کا انتظام کرنا، مسلمانوں میں تعلیمی سرگرمیوں کی واضح مثالیں ہیں۔

۱۰۔ اسلامی ریاست اگرچہ ایک نظریاتی ریاست تھی جس کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی، مگر یہ مذہبی رواداری کے اصول پر مبنی ریاست تھی۔ میثاق مدینہ میں آپ نے یہودی عوام کو ان کے عقائد و مذہب اور دیگر بنیادی حقوق کے تحفظ کی ضمانت دی[31]۔ اس کے علاوہ خیبر کے یہود، نجران کے نصاریٰ اور بحرین اور یمن وغیرہ کے مجوس وغیرہ، جو مسلمانوں کے زیر انتظام آئے سب کو ان کے مذہب و ثقافت پر آزاد رکھا گیا۔ معمولی سے جزیہ کے عوض ان کی حفاظت کی ذمہ داری لی گئی اور انہیں فوجی خدمات سے بھی بری الذمہ قرار دیا گیا اور کسی پر بھی قبول اسلام میں جبر واکراہ نہیں کیا گیا۔

۱۱۔ ریاست مدینہ کا ہر اہلکار مسئول اور جواب دہ تھا۔ ایک مہم میں حضرت اسامہ بن زیدؓ کے ہاتھوں ایک ایسا شخص قتل ہو گیا جس نے قبول اسلام کا اظہار بھی کر دیا تھا، تو حضور اقدسؐ نے اس پر سخت خفگی کا اظہار فرمایا[32]۔ ایسے ایک موقع پر حضرت خالد بن ولیدؓ نے ایک قبیلہ کے کچھ لوگوں کو قتل کر دیا جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا تو حضور اقدسؐ نے خالد بن ولیدؓ کے اس فعل سے نہ صرف اعلان برات فرمایا بلکہ حضرت علیؓ کو بھیج کر ان کے جانی و مالی نقصان کا ازالہ فرمایا۔ آپؐ کا ایک عامل زکوٰۃ و صدقات واپسی پر ان صدقات کے مال کے علاوہ وہاں سے اپنے لیے کچھ ہدایا وغیرہ بھی لایا۔ حضور اقدسؐ نے ایک عمومی خطاب کے ذریعے اس پر تنبیہ فرمائی اور ایسے مواقع پر ہدایا لینے سے منع فرمایا۔

ایک مرتبہ خود نبی کریم ﷺ کے ہاتھوں ایک صحابی کے بطن سے آپؐ کے عصاء کے سرے سے خراش آگئی تو آپؐ نے خود کو بدلہ کے لیے پیش کر دیا۔ مگر اس صحابیؓ نے عرض کیا کہ میں نے معاف کر دیا۔

انتظامی عہدے:

ریاست مدینہ کے آپؐ خود بیک وقت دینی و دنیاوی تمام معاملات کے سربراہ اعلیٰ تھے۔ آپ قانون دینے والی بھی تھے۔ فوجی کمانڈر بھی، منصف اعلیٰ بھی اور پوری انتظامیہ کے سربراہ بھی تھے۔ ہر معاملہ میں آپؐ آخری سند کی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن اہم معاملات میں آپ ہمیشہ اپنے اصحاب و اعوان سے صلاح و مشورہ فرمایا کرتے تھے۔

انتظامی امور میں حضرت ابو بکر صدیقؓ سے مشورہ و معاونت لیتے تھے۔ یہاں تک کہ لوگ انہیں حضورؐ کا وزیر کہنے لگے تھے۔[33]

آپؐ نے جزیرہ نماز عرب کو متعدد صوبوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اور ہر علاقے پر ایک عامل مقرر فرمایا تھا۔ صوبے میں قانون کی تنفیذ اور امن و امان کے قیام کی ذمہ داری عامل کی ہوتی تھی۔ آپؐ نے سب سے پہلے حضرت عتاب بن اسیدؓ کو مکہ مکرمہ کا گورنر مقرر فرمایا۔ اور ان کی تنخواہ ایک درہم یومیہ مقرر فرمائی۔ اس سے قبل حکام کی باقاعدہ تنخواہ کا معمول نہ تھا۔ بلکہ فتوحات اور مال غنیمت سے انہیں بھی حصہ مل جاتا تھا۔ اس کے علاوہ صوبائی گورنروں میں خالد بن سعیدؓ (صنعا)، ابو سفیان بن حربؓ (نجران) اور عمرو بن العاصؓ (عمان)

[31] Sīrat Ibn-e-Hashaām, 1:279.

[32] Sīrat Ibn-e-Hashaām (Tafsīr Sūrat al-Nisā'),1:260.

[33] Qāzī Muḥammad Sulemān Manṣurpurī, Rahmat Lil 'ālamīn (Lahore: Progressive Books, 1994), 1:260.

شامل ہیں۔

زکوٰۃ وصدقات کی وصولیابی کے لیے الگ سے عاملین زکوٰۃ کا تقرر ہوتا تھا۔ یہ حضرات آپؐ کے تربیت یافتہ اور حسابات زکوٰۃ کے ماہر ہوتے تھے۔ اور بہترین کردار کے مالک ہوتے تھے۔ ان کے لیے ضروری تھا کہ لوگوں کے ساتھ نرمی سے پیش آئیں۔ زکوٰۃ میں ان کے بہترین اموال وصول نہ کریں بلکہ اعتدال سے کام لیں۔ کسی عہدہ دار کو عوام سے تحفے وہدایا قبول کرنے کی اجازت نہیں تھی[34]۔

آپؐ نے ہر صوبہ میں قاضیوں کا تقرر بھی فرمایا تھا۔ آپؐ نے جتنے قاضی مقرر فرمائے وہ نہایت علم وفضل کے مالک اور اپنی صداقت وامانت میں ضرب المثل تھے۔ مثلاً حضرت علیؓ، معاذ بن جبلؓ اور ابو موسیٰ اشعریؓ وغیرہ کے مقرر کردہ قضاۃ تھے۔

غزوات میں آپ عموماً خود سربراہ ہوتے تھے۔ مگر جن لشکروں میں آپؐ شریک نہ ہوتے تھے تو پھر صحابہ کرامؓ میں سے کسی مناسب شخص کو لشکر کا امیر فرماتے تھے۔ مثلاً جنگ موتہ میں جعفر بن ابی طالبؓ، زید بن حارثہؓ اور عبداللہ بن رواحہؓ کو یکے بعد دیگرے امیر بننے کا حکم فرمایا۔ اس کے بعد کی ایک مہم کا امیر اسامہ بن زیدؓ کو مقرر فرمایا۔ فوجی امیروں کو ہدایات ہوتیں کہ عورتوں، بچوں اور معذوروں پر ہاتھ نہ اٹھائیں۔ دشمن کے کھیت، باغات اور مویشیوں کو تباہ نہ کریں۔ اور مال غنیمت میں خیانت کی سختی سے ممانعت تھی[35]۔ آپؐ کی اس تربیت وہدایت کا اثر تھا کہ مسلمان سپاہی غیر اخلاقی حرکتوں اور عہد شکنی وغیرہ جیسے نامناسب امور سے باز رہتے تھے۔ حضور اقدسؐ کے زمانے میں ۵/۴ حصہ جنگ میں شریک لوگوں میں تقسیم ہوتا تھا۔

آنحضرت ﷺ مختلف امور میں اہل کاروں کے تقرر کے وقت ان کی مخصوص صلاحیتوں کو پیش نظر رکھتے تھے۔ آپؐ نے اہل نجران سے ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ میں تمہارے پاس ایسا حاکم بنا کر بھیجوں گا جو امین ہو گا، امین ہونے کا حقدار ہو گا۔ یہ سن کر آپؐ کے صحابہؓ اس کا انتظار کرنے لگے۔ پھر حضور اقدسؐ نے ابو عبیدہ کو حاکم بنا کر بھیجا[36]۔ مالیات سے متعلق امور میں عموماً ان کا تقرر ہوتا تھا کیونکہ وہ وصف امانت میں نمایاں شان کے حامل تھے۔ حضرت ابو ذر غفاریؓ اگرچہ برگزیدہ صحابی تھے۔ انہوں نے ایک مرتبہ حضور اقدس سے عرض کیا: آپؐ مجھے عامل نہیں بناتے؟ تو حضور اقدسؐ نے اپنا ہاتھ ان کے کندھے پر مار کر فرمایا: اے ابوذر! آپ ناتواں (شخص) ہیں، یہ (حکومت کے معاملات ایک) امانت ہیں اور یہ قیامت کے دن رسوائی اور شرمندگی ہے، سوائے اس کے کہ جس نے اس کے حقوق پورے کیے اور اس بارے میں جو اس کی ذمہ داری تھی اس کو ادا کیا۔

آنحضرت ﷺ اہلکاروں کے تقرر میں اس شخص کو کوئی عہدہ عطا نہیں فرماتے تھے جو خود سے اس کا طلب گار ہوتا[37]۔ اس بارے میں آپؐ کا ارشاد ہے: "اے عبد الرحمٰن بن سمرہ! آپ امارت کا سوال مت کرنا۔ کیونکہ اگر آپ کو (حکمرانی) سوال کرنے پر ملی تو آپ اس کے سپرد کر دیئے جائیں گے اور اگر آپ کے بغیر سوال کے ملی تو آپ کی اس پر (من جانب اللہ) مدد کی جائے۔

ریاست مدینہ کا نظام مالیات:

عہد رسالت ﷺ میں عوام کے لیے انفرادی اقتصادیات کے ذرائع زراعت، تجارت، صنعت وحرفت، وراثت اور بیت المال

---

[34] Dr. Ḥassan Ibrāhīm, Musilmano ka Nazam Mamlikat (Karachi: Dār al-Ishā'at, S.N), 133.
[35] Mishkāt: Bāb al-Qitāl Fi al-Jihād.
[36] Dr. Amīr Ḥassan Siddīqī, Islāmī Riyāsat, 64.
[37] Bukhārī, Al-Jāmi' al-Saḥīḥ, Kitāb al-Aḥkām.

تھے جبکہ ریاستی سطح پر آمدن مدات مندرجہ ذیل تھیں:

زکوٰۃ وعشر (التوبہ ۹: ۱۰۳): سونا، چاندی، مال تجارت، تجارتی مکانوں، جانوروں اور زائد دولت پر ۲ھ میں چالیسواں حصہ (صاحب نصاب کے لیے) اللہ کی راہ میں دینا فرض ہوا۔ اس طرح مسلمانوں کو اپنے مال پاک رکھنے کا سلیقہ بتایا گیا اور اس حصہ مال کو معاشرے کے غریب طبقوں میں تقسیم کیا جاتا۔ عشر، مسلمان کاشتکاروں پر عائد شدہ لگان تھا جو بارانی زمینوں پر فصل کا دسواں حصہ اور چاہی زمینوں پر بیسواں حصہ فرض تھا۔

سربراہ مملکت کی لیے مال غنیمت کا جو ۵/۱ حصہ تھا اس کی پانچ ذیلی مدات تھیں اور اس طرح رسول اللہ ﷺ کا حصہ خمس میں پانچواں تھا اور کل مال غنیمت میں پچیسواں... رحمۃ للعالمین ﷺ اپنے حصہ میں آنے والے اس مال کو مزید تین حصوں میں تقسیم کرتے: ۱۔ اللہ کی راہ میں دیتے ۲۔ اپنے نائب کو عطا کرتے اور ۳۔ یتیموں، مسکینوں اور مسافروں میں بانٹ دیتے۔

فے (الحشر ۵۹: ۵۔۸): وہ مال اور زمین جو بغیر جنگ کے ریاست کی ملکیت میں آجائے۔ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ایسے مال کی سرکاری سطح پر اللہ، رسول اللہ ﷺ اہل قربت، یتامیٰ، مساکین، مسافروں اور مہاجرین پر صرف کیا جاتا[38]۔ مثال کے طور پر بنو نضیر، بنو قریظہ اور خیبر کے علاقے کی زمین وغیرہ کو رسول اللہ ﷺ نے سرکاری ملکیت قرار دے کر مذکورہ بالا مدات میں خرچ کر دیا۔

خراج: زمین پر محصول جو غیر مسلموں سے وصول کیا جاتا[39]۔ فتح خیبر کے موقع پر یہ رقم مجاہدین کی تنخواہیں اور دیگر قومی اخراجات کی مدات میں صرف کی۔

جزیہ: غیر مسلموں کے صرف آزاد مردوں پر واجب تھا، جب کہ اقلیتوں کے بچے، معذور، بوڑھے، عورتیں، غرباء و مفلسین اور فاتر العقل افراد سے وصول نہیں کیا جاتا تھا۔ اندھے، مفلوج، اپاہج اور راہب لوگ بھی اس سے مستثنیٰ تھے۔ اس ٹیکس کی وصولی میں بھی انصاف اور نرمی سے کام لیا جاتا اور نہایت محتاط رویے کے ساتھ وصول کیا جاتا۔ اگر کوئی ذمی (جزیہ دینے والے غیر مسلم) مسلمان ہو جاتا یا ریاست کی کوئی خدمت بجالاتا تو اس سے یہ ٹیکس ساقط ہو جاتا۔[40] نبی کریم ﷺ نے اسلامی ریاست میں معاشیات کی بنیاد، مال دولت کی گردش پر رکھی ہے۔ ریاست مدینہ میں، صاحبان مال و زر سے دولت کی وصولی اور ضرورت مندوں میں اس کی تقسیم کا اہتمام سرکاری سطح پر کیا گیا۔ کیونکہ قرآن نے زکوٰۃ کی حکمت یہ بتائی ہے کہ اس سے دولت کا بہاؤ غریبوں کی طرف ہوتا ہے۔ (الحشر ۵۹: ۷)

صدقات او ر انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب اور ترویج رسول اللہ ﷺ نے ایسے انداز سے کی کہ خود ہر وقت تقسیم ہی کرتے رہتے[41]، لہٰذا لوگوں میں محروم طبقوں کے ساتھ ہمدردی اور ان کی معاشی ضرورتوں کا خیال رکھنا، مدنی معاشرے کا طرہ امتیاز بن گیا۔ رسول خدا نے، ریاست مدینہ کی طرف سے مجبور طبقوں کی کفالت ہر پہلو سے یوں کی کہ آج کی فلاحی ریاست اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ آپ ﷺ کا یہ فرمان ہمیشہ یاد رکھا جائے گا: أنا ولی من لا ولی لہ[42]۔ جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اس کا سرپرست، اللہ اور اس کا رسول ہے۔

---

[38] Imām Abū Yūsuf, Kitāb al-Khirāj, 20.

[39] Al-Balāzrī, Fatūḥ al-Baldān, 24-26.

[40] Imām Abū Yūsuf, Kitāb al-Khirāj, 117.

[41] Ibn-e-Sa'd, Tabqāt, 1:169.

[42] Tirmazī, Al-Sunan, 2:31.

امور خارجہ اور معاملات دفاع:

ریاست مدینہ کا مطالعہ امور خارجہ اور امور دفاع کے حوالہ سے بھی منفرد اصول سامنے لاتا ہے کہ آپؐ نے اپنی خارجہ پالیسی میں امن، صلح اور بین الاقوامی معاہدوں کو بنیاد بنایا۔ آپؐ نے دوست بڑھانے اور دشمن کم کرنے پر توجہ رکھی۔ اگر کسی ناگزیر جنگ کا سامنا کرنا پڑا تو اس میں سے امن سلامتی کے سارے ممکنہ ذرائع کو پہلی ترجیح میں رکھا۔

مدینہ کی اسلامی ریاست کے گرد، رسول خدا ﷺ نے ابتداء ہی سے ایک دفاعی حصار قائم کر لیا تھا اس طرح مدینہ کی منتشر آبادی کی مرکزی حکومت کے تحت آگئی۔ اس سلسلہ میں آپ نے درج ذیل اقدام کیے:

۱۔ ہجرت کے چند مہینے بعد ہی مدینے کے جنوب مغربی حصے اور ساحل سے ملے ہوئے علاقوں میں، آپ بار بار تشریف لے گئے اور قبائل جہینہ، بنی ضمرہ، بنو مدلج، بنو غفار، بنی مزینہ، بنو عامر، بنو خزاعہ، بنو اسلم، قضاعہ وغیرہ سے دفاعی و سیاسی معاہدے کئے گئے۔ معروف معاہدوں میں معاہدہ جہینہ، معاہدہ حدیبیہ، معاہدہ ثقیف، دومۃ الجندل اور معاہدہ نجران شامل ہیں۔

۲۔ بعض معاہدوں میں کچھ قبائل نے حضور ﷺ کے دشمنوں سے دوستی نہ رکھنا قبول کیا، بعض قبیلے غیر جانبدار رہنے پر تیار ہوئے اور بعض کے ساتھ، کسی بھی حلیف پر حملہ ہونے کی صورت میں مشترکہ دفاع کا فیصلہ قرار پایا۔ اس طرح دشمنوں میں کمی اور دوستوں میں اضافے کی حکمت عملی اپنا کر رسول اللہ ﷺ نے خارجی امور کو اپنے حق میں کر لیا۔

۳۔ امور خارجہ یعنی بیرون ممالک سے خط و کتابت، سفارت کاروں کا تقرر اور معاہدات کے لیے باقاعدہ ایک شعبہ قائم کیا گیا جس کا کام ان معاملات کی نگرانی کرنا تھا۔ اس شعبہ میں غیر ملکی زبانوں کے ماہرین، مترجمین، ترجمان اور قلم کار شامل تھے جن میں عبد اللہ بن راقم اور زید بن ثابت خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۴۔ امور خارجہ اور نبوی سیاست کا شاہکار، صلح حدیبیہ ہے جسے قرآن فتح مبین اور نصر عزیز (الفتح ۴۸: ۱۔۳) قرار دیتا ہے اس معاہدے میں بظاہر، مسلمان قریش کی منہ مانگی شرائط قبول کرتے گئے، جس پر کئی صحابہ نے بے چینی کا اظہار بھی کیا مگر آخر کار اس سے جو فوائد حاصل ہوئے[43] وہ نگاہ نبوت سے پوشیدہ نہیں تھے لہٰذا آپؐ نے ایک طرف اس کے ذریعے امن و امان کی ضمانت حاصل کر لی دوسری طرف قریش کے سارے مطالبے مان کر ان کی مخالفت کے سارے ہتھیار بے کار کر دیے۔ اس طرح یہ معاہدہ، اشاعت اسلام اور فتح مکہ کا پیش خیمہ بن گیا۔

۵۔ ٦ اور ٧ھ میں رسول اللہ ﷺ نے مختلف بادشاہوں اور قبائلی سرداروں کے نام خطوط ارسال فرمائے۔ آپ کی سرکاری دستاویزات کی تعداد تقریباً سوا دو سو تک ہے۔ حبشہ کے نجاشی، بازنطینی حکمران، قیصر، ہرقل، ایرانی بادشاہ خسرو پرویز، بحرین کے حاکم منذر اور مصر کے مقوقس کے علاوہ کئی حکمران کو خطوط میں یہ واضح کیا کہ اسلام کے نظام حیات سے وابستہ ہو جانے میں بھلائی، عزت اور سلامتی ہے۔ مثال کے طور پر قیصر روم کے نام آپؐ کا مکتوب ملاحظہ ہو:

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ. مِنْ مُحَمَّدٍ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى هرقل عظيم الروم، سلام عَلَى من اتَّبع الْهُدَى. أما بَعْدُ فَإِنِّي أَدْعُوكَ بِدِعَايَةِ الإِسْلامِ، أَسْلِمْ تَسْلَمْ، وَأَسْلِمْ يُؤْتِكَ اللَّهُ أَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ، وَإِنْ تَوَلَّيْتَ فعليك إثم الأريسيين و يا أهل الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إلا اللَّهَ وَلا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا

[43] Dr. Muḥammad Ḥamīdullah, Al-Wathā'iq al-Siyasiyah (Beirūt: 1985), 14,36,80-82.

بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ [44]

۶۔رسول اللہ ﷺ حسب ضرورت سفارتوں کا تبادلہ کرتے رہتے مثلاً سفارت بنی ثقیف، بنی تمیم، بنی سعد، بنی طے اور بنی زبید وغیر اس کی مثالیں ہیں۔ اسی طرح امراء وملوک کو تحائف روانہ کرتے۔ دیگر ریاستوں کے سفارت کار آتے تو ان کا استقبال، عزت وتکریم اور مہمان نوازی کا اہتمام ہوتا۔

۷۔ مؤرخین نے ۹ھ کو "سنۃ الوفود" یا "عام الوفود" کا نام دیا ہے کیونکہ ۸ھ میں فتح مکہ کی عظیم الشان کامیابی کو قرآن نے سورۃ النصر میں بیان فرمایا ہے۔

۸۔ قرآن مجید میں سرکاری اہتمام کے تحت اخراجات کی جو مدات مقرر کی گئی ہیں ان میں محتاجوں اور مسکینوں کے ساتھ ایک اہم مد "مؤلفۃ القلوب" بھی دی گئی ہے (التوبہ ۹: ۶۰) لہٰذا لوگوں کو اسلام کی طرف راغب کرنے کے لیے سرکاری خزانے میں سے ایک حصہ مختص کرنا، فتح مکہ سے قبل قحط پڑنے پر اہل مکہ کو رسول اللہ ﷺ نے پانچ سو اشرفیوں کی امداد روانہ کی تھی۔ اسی طرح مدینہ کی اسلامی ریاست میں نو مسلموں کو بڑے بڑے انعام و اکرام دیئے جاتے، ان کے اعزاز ملحوظ رکھے جاتے اور ہر طرح ان کو محسوس کرایا جاتا کہ صرف روحانی اوراخروی ہی نہیں ، دنیاوی اور مادی حیثیت سے بھی ان کا جدید مذہب ان کے لیے سراسر مفید ہے۔

دفاعی منصوبہ بندی اور آداب جنگ:

مدنی زندگی کے دس سالوں میں اسلامی ریاست کے ارتقاء کے دوران رسول خدا ﷺ نے قرآن کی روشنی میں مندرجہ ذیل اصولوں پر دفاعی منصوبہ بندی کی بنیاد رکھی:[45]

۱۔	انسانی جان کا احترام	۲۔	امن، انصاف اور قانون کی بالادستی
۳۔	نظام تمدن کی حفاظت	۴۔	اجتماعی فتنے کا استیصال
۵۔	ظلم وتعدی کا مؤثر جواب	۶۔	مدافعانہ ومصلحانہ جنگ
۷۔	راہ حق کی حفاظت	۸۔	ناحق خوں ریزی سے اجتناب
۹۔	مظلوم مسلمانوں کی حمایت	۱۰۔	اسلامی ریاست کا تحفظ

ان زریں اصولوں کی بنیاد پر آپ ﷺ نے مصالحانہ اور مدافعانہ جہادی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ایسی مہمات کی کل تعداد اٹھائی کے قریب بنتی ہے جن میں سے ستائیس یا اٹھائیس میں آپ ﷺ خود شریک ہوئے، نو غزوات میں جنگ ہوئی اور باقی اٹھارہ میں تلوار کے استعمال کا موقع ہی نہیں آیا۔بقیہ ساتھ مہمات میں صحابہ کرامؓ کو سپہ سالار بنایا گیا۔

تمام لڑائیوں میں مخالفین کے قیدیوں کی کل تعداد ۶۵۶۴ بنتی ہے[46]۔ ان اسیران میں سے ۶۳۴۷ کو بغیر کسی شرط کے اور ۲۰۷ کو فدیہ ادا کرنے پر رہا کر دیا گیا۔ صرف دو کو ثابت شدہ مقدمہ قتل کے نتیجے کے طور پر قصاص میں قتل کیا گیا۔ کل مقتولین کی تعداد ایک

---

[44] Ibn-e-Sa'd, Tabqāt, 1:328-299.

[45] Al-Māidah, 5:32,64. یہ اصول درج ذیل آیات قرآنی سے ماخوذ ہے : المائدہ : 32، 64؛آل عمران : 1۔ 4، 110؛ الانفال : 55۔ 58، 60؛ البقرہ : 190۔ 194؛ الحج : 39۔ 41؛ محمد :4؛ النساء : 75، 91؛ احزاب : 60۔ 61

[46] Qāzī Muḥammad Sulemān Manṣurpurī, Rahmat Lil 'ālamīn, 2:1946.

ہزار چودہ(۲۵۵ مسلمان شہداء اور ۷۵۹ مخالفین مقتول) بنتی ہے جن میں نصف مسلمانوں کے اور نصف مخالفین کے تھے۔

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ رسول خدا ﷺ جب کسی کو سپہ سالار بنا کر بھیجتے تو اسے ہدایت فرماتے کہ دشمن کے سامنے تین چیزیں پیش کرنا اول اسلام، دوسرے جزیہ، تیسرے جنگ۔ اگر وہ اسلام قبول کرلے تو پھر اس پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے۔ اگر جزیہ دے کر اطاعت قبول کرلے تو اس کی جان و مال پر کسی قسم کی تعدی نہ کرو لیکن اگر وہ اس سے بھی انکار کرے تو اللہ کی مدد مانگ کر جنگ کرو۔ رسول خدا ﷺ کا اسوہ منفرد نظر آتا ہے جو انسانیت کی تباہی کی بجائے انسانیت کی حفاظت کا زریں اصول پیش کرتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اس سلسلے میں جو اصلاحات متعارف کروائیں، جنگوں کی تاریخ میں کہیں ایسے اصولوں کا سراغ تک نہیں ملتا، جیسے مثال کے طور پر آپ کی درج ذیل ہدایات:

۱۔ غفلت (یارات کے وقت نیند) کی حالت میں حملہ کرنے سے احتراز۔

۲۔ غیر اہل قتال اور مطالبہ کرنے والوں کو امان۔

۳۔ باندھ کر تکلیفیں دے دے کر دشمن کو مارنے پر پابندی

۴۔ لوٹ مار حرام

۵۔ تباہ کاری اور فساد انگیزی سے اجتناب۔

۶۔ آگ میں جلانے کی ممانعت

۷۔ مثلہ (لاشوں کی بے حرمتی اور اعضاء کی قطع وبرید) کی ممانعت۔

۸۔ اسیران جنگ، سفیروں، قاصدوں اور نمائندوں کے قتل کی ممانعت۔

یہ تھی رسول کی رحمت کی جنگی حکمت عملی! اس سلسلہ میں ڈاکٹر حمید اللہ کی تحقیق ملاحظہ ہو:

عہد نبوی میں دس سالوں میں دس لاکھ مربع میل سے زیادہ کا علاقہ فتح ہوا۔ جس میں یقیناً کئی ملین آباد تھی۔ اس طرح روزانہ تقریباً ۲۷۴ مربع میل کے اوسط سے دس سال تک فتوحات کا سلسلہ ہجرت سے وفات تک جاری رہا۔ ان فتوحات میں دشمن کے ماہانہ دو سے بھی کم آدمی قتل ہوئے جبکہ اسلامی فوج کا نقصان اس سے بھی کم ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد نبویؐ ہے: "انا نبی الرحمۃ أنا نبی الملحمۃ"....اس کا اس سے بہتر ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ دشمن کے ستر آدمیوں کا مارا جانا (جنگ بدر میں) سب سے بڑی تعداد ہے![47]

نبی اکرم ﷺ شہنشاہ دو جہاں کی عاجزی و انکساری:

آپ ﷺ کی آمد سے پہلے سلاطین زمانہ اونچے اونچے محلوں میں رہتے تھے۔ سونے چاندی اور زر وجواہر کے زیوروں سے آراستہ ہوتے تھے، تکبر ورعونت اور جاہ وجلال ان کے چہرے سے ٹپکتا تھا لیکن آپ ﷺ نے زمین کے زروں سے لے کر آسمان سے ستاروں تک کا مالک ہونے کے باوجود عاجزی اور انکساری اختیار کی آپ نے پستی اور بلندی کی تفریق مٹادی اور خوبیوں اور فضیلت کا معیار تقویٰ قرار دیا۔

چنانچہ آپ ﷺ کی ظاہری وضع قطع انتہائی سادہ تھی۔ ایک مرتبہ ایک صحابی شاہی عبا لے کر آئے، چونکہ آنحضرتؐ کی خدمت میں عرب کے مختلف حصوں سے وفود حاضر ہوا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ آپ ﷺ اسے خرید

[47] Syed Abū al-A'lā Maudūdī, Al-Jihād fi Al-Islām (Lahore: Tarjimān al-Qur'ān, 1996), 98.

لیں تا کہ جب دوسرے شہروں یا ملکوں سے وفود آپ ﷺ کی خدمت میں آئیں تو آپ ﷺ اسے زینت تن فرمالیں یا جمعہ کے دن جو گویا مسلمانون کے دربار عام کا دن ہے، آپ ﷺ اسے پہنیں۔ اس وقت حضرت عمرؓ کی نظر اس ظاہری جاہ و جلال اور تزک و احتشام پر گئی جس کے شایان وقت عادی تھے، لیکن حضور ﷺ نے اشتباہ کے اس پردے کو فوراً چاک کر دیا کہ مسلمانون کا پیشوا شاہانہ جاہ و جلال کے اظہار کے لیے مبعوث نہیں ہوا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص سے پہنتا ہے، آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں ہے۔

اسی طرح نشست میں بھی آپ ﷺ نے تفوق و برتری کے امتیاز کو اس قدر مٹایا کہ مجلس کے اندر آپ ﷺ میں اور ایک عام آدمی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا، چنانچہ آنحضرت ﷺ جب صحابہ کرامؓ کی مجلس میں بیٹھتے تو باہر سے آنے والے کو پوچھنا پڑتا کہ محمد ﷺ کون ہیں؟ لوگ اشارے سے بتاتے۔ صحابہ کرامؓ نے چاہا کہ کم از کم ایک چبوترہ ہی بنا دیا جائے، جس پر آپ ﷺ جلوہ افروز ہوں، مگر اسے بھی آپ ﷺ نے پسند نہیں فرمایا[48]۔

سادگی:

ایک بار حضرت عمرؓ آپ ﷺ کے پاس حجرے میں حاضر ہوئے جہاں آپ ﷺ کی ضرورت کی چیزیں رہتی تھیں، دیکھا تو آپ ﷺ ایک چمڑے کے تکیے سے جس میں کھجور کے پتے اور چھال بھری ہوئی تھی، ٹیک لگائے ہوئے ایک کھردری چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں اور جسم مبارک پر چٹائی کے نشان پڑ گئے ہیں، حجرے میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی، لیکن تین سوکھے چمڑوں کے سوا دوسرا اثاث البیت نظر نہ آیا، ایک طرف مٹھی بھر جو رکھے تھے۔ اس منظر سے حضرت عمرؓ سخت متاثر ہوئے اور ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

حضور اکرم ﷺ نے رونے کا سبب پوچھا عرض کیا: اے اللہ کے نبیؐ میں کیوں نہ روؤں، جب میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ (بستر نہ ہونے سے) چٹائی کے نشان پشت مبارک پر پڑ گئے ہیں اور آپ ﷺ کا سارا اثاث البیت میرے سامنے ہے، ادھر قیصر و کسریٰ ہیں، جو باغ و بہار اور عیش و آرام کے مزے لوٹ رہے ہیں اور حضور اللہ کے رسول ہیں اور ان سے بے نیاز ہیں۔ ارشاد ہوا کہ اے ابن خطاب! کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ ہم آخرت میں لیں اور وہ دنیا میں؟ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ جی ہاں! بے شک یا رسول اللہ ﷺ

شہنشاہ دو عالم کا بستر مبارک:

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ سرور کائنات، شہنشاہ دو عالم حضرت محمد ﷺ ایک چٹائی پر سوئے ہوئے تھے پھر اٹھے تو آپ ﷺ کے پہلو میں اس چٹائی کے نشان پڑے ہوئے تھے۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اجازت ہو تو آپ ﷺ کے لیے نرم بچھونا تیار کریں۔ یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا، میرا دنیا کے آرام و آسائش سے کیا واسطہ؟ میں تو دنیا میں اس مسافر کی طرح ہوں جو ذرا دیر کسی درخت کے سایہ میں ٹھہر گیا ہو، پھر اسے چھوڑ کر چل کھڑا ہو۔ حضور اکرم ﷺ نے خود اپنے عہد میں عدل و انصاف کے تمام تقاضوں کو عملاً پورا کر کے دکھایا اور اپنے اسوہ حسنہ سے انصاف کا ایک ایسا نظام پیش فرمایا کہ آج تک دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اسی طرح صحابہ کرامؓ کی زندگیوں کا بھی مطالعہ کریں، آپ کو ہر جگہ اسوہ رسول ﷺ کے مطابق عدل وانصاف کی حکمرانی نظر آئے گی جس میں چھوٹے بڑے، امیر و فقیر، شریف و وضیع اور سلطان و گدا کی کوئی تمیز باقی نہیں ہے، کیوں کہ اسلامی قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔

---

[48] Syed Sulemān Nadvī, Al-Sīrat al-Nabvī (Lahore: Al-Faisal Nashiran, s.n), 43-44.

حکومت ملکیت کے بجائے امانت:

آپ ﷺ نے حاکمیت انسانی کی کلی نفی کی۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق کہ حکم صرف اللہ کے لیے ہے حاکمیت کو اللہ تعالیٰ کی ملکیت قرار دیا کوئی فرق کوئی خاندان اور کوئی قوم کلی اختیار کا مالک نہیں وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق ہی حکومتی ذمہ داریوں سے عہدہ براہ ہو سکتا ہے۔ آپ ﷺ نے اسلامی مملکت کے اصول و قوانین، نظام فوج داری کی تدوین، خارجہ پالیسی، بین الاقوامی تعلقات، سیاست کے پیچ وخم، معاشی بدحالیوں میں اپنا طریقہ کار، اقتصادی ناہمواریوں میں اپنا کردار، کفار کے ساتھ صلح و آشتی کے مواقع، دشمنوں کو صفوں کو پیوند خاک کرنے کی تدابیر، ذمیوں کے ساتھ اسلامی سلطنت کا برتاؤ، مرتدوں کے ساتھ اسلام کا طرز عمل، جنگی قیدیوں کے ساتھ سلوک، غرض یہ کہ انسانی زندگی اور اسلامی سلطنت کا کوئی ایسا موڑ نہیں جہاں پر آپ نے حسن عمل سے حکمرانوں کی رہنمائی نہ فرمائی ہو۔

قانون کی بالادستی:

اسلام کے سیاسی نظام میں فرد کی حاکمیت کی بجائے شرعی قوانین کی بالادستی تسلیم کی گئی ہے۔ شرعی قوانین ہی حاکم مطلق کے احکامات کے آئینہ دار ہیں وہی تمام اختیارات اور شہریوں کے حقوق و فرائض کا تعین کرتا ہے۔ قوانین کا اطلاق سب پر ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں ادنیٰ اور اعلیٰ کی تمیز روا نہیں رکھی گئی۔ آپ ﷺ نے جس معیاری نظام عدل کو انسانیت کے سامنے پیش فرمایا اس کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس نظام کے ذریعے مملکت کے ہر فرد کو حقوق کی ضمانت دی گئی ہے اور حکومت کے فرائض میں شامل ہیں کہ مملکت کے ہر باشندے کی عزت و آبرو، مال و جائیداد، جسم و جان اور چادر و چار دیواری کے تحفظ کا اہتمام کرے اور عدل و انصاف کی بنیاد پر ہر اس شخص کے حقوق کی پاسداری کا بندوبست کریں، جو مملکت کا شہری ہے ورنہ وہ نااہل تصور ہوں گے اور اپنی کوتاہیو اور فرائض سے غفلت پر اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بچ نہیں سکیں گے۔ جیسا کہ سورۃ نساء میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَاۙ وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ﴾[49]

علامہ سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں[50] :

> ”آیت بالا میں لفظ ”ناس“ بھی غور کے قابل ہے، یہ نہیں کہا گیا کہ اس انصاف کا لحاظ صرف مسلمانوں کے درمیان کرو ،بلکہ فرمایا گیا کہ لوگوں کے درمیان کرو، جس میں مسلم اور غیر مسلم سب داخل ہیں، انصاف اور قانون کی نظر میں سب کو مساوات اور یکسانی حاصل ہے اور اسی سے اسلامی حکومت کی اصل خصوصیات نمایاں ہو سکتی ہیں۔“

چنانچہ حکومت اگر ایک جسم ہے، تو اس کے تمام ملازمین اور چھوٹے بڑے افسر اس کے اعضاء و جوارح ہیں، اگر حکومت کی کوئی مجسم شکل ہوتی تو اس کے ہاتھ، پیر، آنکھ، کان اور ناک وغیرہ یہی لوگ ہوتے، جو کانسٹیبل اور کلرک سے لے کر کروزراء تک شمار ہوتے ہیں، حکومت کی اچھائی اور برائی انہی لوگوں کی اچھائی اور برائی سے ہوتی ہے، اگر عام لوگ ان سے اذیت اور دکھ محسوس کرتے ہیں تو حکومت بری کہلائے گی اور اگر عوام کو ان سے راحت واطمینان حاصل ہو تو حکومت اچھی کہلائے گی۔ اسلام میں حکومت کا مطمع نظر ہی یہ ہے کہ انسانوں کے تمام مسائل و معاملات کو عدل وانصاف کے ساتھ انجام دیا جائے اور انہیں کتاب وسنت کے مطابق زندگی

---

[49] Al-Nisā', 4:41.

[50] Syed Sulemān Nadvī, Islām mein 'Ummāl Ḥakūmat aur un kī Zimma dāriyan, 9.

گزارنے کے مواقع بہم پہنچائے جائیں تاکہ اللہ کی رضا حاصل ہو۔

کمزوروں کے ساتھ حسن سلوک:

نبی کریم ﷺ کے مزاج میں حد درجہ نرمی اور رافت تھی اور یہی وصف آپ اپنی امت میں دیکھنا چاہتے تھے۔ نرمی کا ایک پہلو دوسرے کی کمزوری کا خیال اور اس کے ساتھ رعایت کرنا ہے۔ ضعیفوں کا لحاظ، خواتین کے مسائل کو ترجیحاً حل کرنا بھی نرمی ہی کا ایک انداز ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جب تم میں سے کوئی شخص لوگوں کو امام بنے تو انہیں ہلکی نماز پڑھائے کیونکہ ان میں بچے، بوڑھے، کمزور اور مریض بھی ہوتے ہیں۔ جب وہ اکیلا پڑھے تو جیسے چاہے پڑھ لے۔“ [51] جس طرح امامت صلوٰۃ ایک ذمہ داری ہے بعینہ اسی منصب پر فائز شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ عوام کے لیے آسانی اور یسر کے پہلو کو ہمیشہ مد نظر رکھے۔

خدمت خلق:

آپ ﷺ کی ذات میں خدمت و خلق کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ آپ کو لوگوں کے حقوق کی بہت فکر رہتی تھی۔ آپ کے نزدیک حاکم مخلوق خدا کا نگہبان ہے اور قیامت کے دن لوگوں کے حقوق کے بارے میں جواب دہ ہوگا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

> ”تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ اور امام جو لوگوں پر حاکم ہے، نگہبان ہے اور اس کی رعیت کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ آدمی اپنے گھر والوں کو نگہبان ہے اور اس سے ان کے متعلق سوال کیا جائے گا“۔[52]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ اور معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف بھیجا اور فرمایا، آسانی کرو، مشکل نہ کرو۔ نفرت نہ دلاؤ اور آپس میں اتفاق رکھو اور اختلاف نہ کرو۔

شفقت و نرمی:

حکمران عوام کے لیے شفقت و محبت کا نمونہ ہونا چاہیے کیونکہ سختی سے بد دلی پیدا ہوتی ہے جو کہ فساد اور بگاڑ کا باعث بنتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ انتہائی شفیق اور مہربان سربراہ ریاست تھے۔ ایک صحابی فرماتے ہیں: میں بچہ تھا اور درختوں پر پتھر مار کر کھجوریں کھایا کرتا تھا، اس پر نبی اکرم ﷺ نے مجھے اس طرح سمجھایا "یا غلام لم ترمی النخل" (لڑکے تم کھجوروں کو پتھر کیوں مارتے ہو؟) میں نے کہا میں انہیں گرا کر کھالیتا ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا: پتھر پھینک کر گرایا نہ کرو البتہ نیچے پڑی ہو تو اسے کھا لیا کرو۔ یہ کہہ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا: "اللھم اشبع بطنہ" (اے اللہ اسے سیر شکم کردے۔)[53] حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ بڑے خوش اخلاق تھے۔ ایک روز مجھے کسی ضرورت کے لیے بھیجا میں نے کہا کہ خدا کی قسم میں نہ جاؤں گا اور میرے دل میں یہ تھا کہ جو حکم مجھ کو رسول اللہ ﷺ نے دیا اس کے لیے ضرور جاؤں گا۔ پھر میں نکلا اور میرا گزر کچھ بچوں سے ہوا جو بازار میں کھیل رہے تھے۔ اتنے میں ناگاہ رسول ﷺ نے میرے سر کے بال پیچھے سے پکڑے۔ جب میں نے آپ ﷺ کی طرف تو آپ ﷺ کو ہنستا پایا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا انس تم وہاں گئے تھے جہاں میں نے تم کو بھیجا تھا۔ میں نے کہا ہاں جاؤں گا یا رسول اللہ۔

---

[51] Mishkāt, Ḥadīth no.2188.

[52] Abū Da'ūd, Al-Sunnan, Ḥadīth no. 2290.

[53] Mishkāt, 212.

اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ:

نبی کریم ﷺ رحمۃ للعالمین ہیں۔ اس لیے آپ کی رحمت عام ہے۔ جس میں غیر مسلم بھی شامل ہیں۔ ایک اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کے حقوق کا تحفظ عقیدے کا حصہ سمجھ کر کیا جاتا ہے۔ اس لیے اسلامی مملکت میں حکومت کے لیے لازم ہے کہ وہ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کرتے ہوئے ان کی دلجوئی کریں۔ اور ان کے مسائل کے حل کی طرف خصوصی طور پر توجہ دیں تاکہ ان کی اسلامی مملکت سے وفاداری مزید مستحکم ہو سکے۔ نبی کریم ﷺ نجران کے عیسائیوں سے جو معاہدہ کیا وہ کمال درجے کی رواداری اور انسان دوستی کی مثال ہے۔ اس کی ایک شق یہ بھی تھی کہ عدل وانصاف اور سماجی انصاف میں ان کے حقوق، مسلمانوں کے حقوق کے مساوی ہوں گے[54]۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "جس نے کسی ذمی کو قتل کر دیا وہ جنت کی خوشبو نہیں سونگھے گا"۔ گویا ایک اسلامی ریاست میں عوام کے ہر طبقے کی رائے کا احترام ہونا چاہیے ان کے حقوق کے تحفظ کے ساتھ ساتھ ان کے درمیان عدل وانصاف اور مساوات اور برابری کا اصول لازمی ہے۔

خلاصہ بحث:

رسول اکرم ﷺ نے اول درجہ کے عامل ریاست کی حیثیت سے انسانی سوسائٹی کی از سر نو تشکیل کی۔ عہد نبویؐ کا سیاسی نظام دنیا کے تمام نظاموں سے افضل، اعلیٰ، قابل تقلید اور قابل مثال ہے کیونکہ اس میں اقتدار اعلیٰ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مخصوص سمجھا جاتا ہے جو کائنات کا مالک ہے جو رب العالمین ہے طاقت و سروری صرف اسی کی ذات کو ذیبا ہے اس کے علاوہ کسی کو حق حاصل نہیں حکمران کا فرض ہے کہ اموری مملکت کو احکامات الٰہیہ کی روشنی میں سرانجام دے۔

نبی اکرم ﷺ کا تیئیس سالہ دور تمام دنیا کے لیے ایک روشن مثال ہے آپ ﷺ نے انسانیت کی رہنمائی کے لیے احکامات قرآن پر عمل کیا اور امور مملکت میں جتنے امور انجام دیے حکم الٰہی کے مطابق انجام دیے۔ آپ ﷺ نے اسلامی جمہوری نظام کی بہترین مثال ریاست مدینہ میں پیش کر دی اور امور حکومت کو چلانے کے لیے حکمرانوں کو بنیادی اصول بھی دے دیے حاکم اور محکوم کے تعلقات رعایا کے حقوق کس طرح محفوظ ہو سکتے ہیں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کی نوبت کیا ہو سکتی ہے یہ سب اصول سکھا دیے نیز ریاست کے دفاع مالی معاملات اور خارجہ پالیسی کے اصول بھی سکھا دیے۔

نبی اکرم ﷺ نے اپنے عمل سے لوگوں کو آگاہ کر دیا کہ حب مال اور حب اختیار اور حب منصب ایسی چیزین ہیں جو دین کے خراب کرتی ہیں لہٰذا ان کا استعمال احکامات الٰہیہ کے دائرے میں ہونا چاہیے آپ ﷺ کی تربیت یافتہ جماعت یعنی (صحابہ کرامؓ) نے بھی اپنی سیرت اور اپنے کردار کے ذریعے امانت اور دیانت، خلق وایثار جود وسخا عوامی خدمت صبر اور عدل وانصاف کی ایسی روشن مثالیں قائم کیں جن سے ہمارے معاشرے کا انسان روشنی پا کر اپنے عمل کو درست کر سکتا ہے۔

[54] Maulānā Taqī Amīnī, 'Urūj wa Ziwāl ka Ilāhī Nizām (Lahore: Makkī Dār al-Kutub,1997), 100.